دو ممکن صورتیں

ایک فلسفی کے لیے صحیح تصورِ حقیقت تک پہنچنے کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا تو اسے کائنات کے تمام حقائقِ علمی کی واقفیت کی قدر حاصل ہو جائے پھر وہ ان کی روشنی میں آسانی سے سمجھ سکے کہ کونسا تصورِ حقیقت ایسا ہے جو ان حقائق سے مطابقت رکھتا ہے اور ان کو منظم کرتا ہے اس صورت میں اس کو تصورِ حقیقت کی فطرت اور اوصاف کا صحیح اندازہ کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی کیونکہ اگر وہ ان حقائق کے علم کے باوجود حقیقت کا کوئی ایسا تصور قائم کرے گا جو کسی پہلو سے تھوڑا سا بھی غلط ہو گا تو کئی علمی حقائق اس کی تردید کرنے کے لیے موجود ہوں گے لیکن یہ اُمید عبث ہے دنیا بھر کے حکماء اور علماء اس بات پر متفق ہیں کہ نوعِ انسانی تا قیامت بھی کائنات کے تمام علمی حقائق کا احاطہ نہیں کر سکتا خود قرآن حکیم نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّیْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ۝

کہیے اے پیغمبر اگر سمندر کا پانی بھی میرے پروردگار کی قدرت کے نشانات کو لکھنے کے لیے بطور سیاہی کے ہو تو پانی نشانات کا ذکر ختم ہونے سے پہلے ختم ہو جائے گا خواہ ہم امداد کے طور پر اتنا ہی پانی اور شامل کر دیں۔

دوسری صُورت یہ ہے کہ فلسفی کو حقیقتِ کائنات کا تصوّر کہیں سے اتفاقاً دستیاب ہو جائے اور اس کا عشق اور وجدانی علم اسے یہاں تک حاصل ہو جائے کہ وہ اس کی روشنی میں ان تمام حقائق علمی کو صحیح طور پر دیکھ سکے اور سمجھ سکے جو آج تک دریافت ہوئے ہیں اور ان کو اس تصوّر کی بنیاد پر دوسرے تصورات کی دخل اندازی کے بغیر متحد اور منظّم کر سکے ایسی حالت میں اگرچہ اس کے پاس حقائقِ علمی کم تعداد میں ہوں گے تاہم حقیقتِ کائنات کے صحیح اور مکمل تصور کی روشنی میں وہ ان کو ٹھیک طرح سے سمجھ سکے گا اور بتا سکے گا کہ کیونکر وہ فقط اس تصور کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں اس صورت میں اس کا نظامِ حکمت ناتمام تو ہو گا لیکن غلط نہیں ہو گا اور جوں جوں حقائقِ علمی

دریافت ہوتے جائیں گے اس کے نظریہ کائنات میں اپنی جگہ پاتے جائیں گے اس طرح سے اس کا نظریہ کامل سے کامل تر ہوتا جائے گا اور یہ عمل تا قیامت جاری رہے گا جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں اس قسم کے فلسفہ کے وجود میں آنے کے بعد فلسفہ کی تمام حقیقی ترقیوں کا دارومدار نئے فلسفوں کے ظہور پر نہیں بلکہ اس فلسفہ کی زیادہ سے زیادہ ترقی اور تکمیل پر ہوگا لیکن اگر فلسفی کو حقیقتِ کائنات کا صحیح تصوّر کہیں سے دستیاب بھی ہو جائے اور وہ اس کے عشق اور وجدانی علم سے بہرہ ور بھی ہو جائے تو پھر بھی اس تصورِ حقیقت سے استفادہ کرنے اور اس کی بنا پر ایک صحیح نظامِ حکمت کی تعمیر کرنے کے لیے یہ شرط ضروری ہوگی کہ اس کے زمانہ میں حقائق علمی یہاں تک ترقی کر چکے ہوں کہ وہ اتفاقی طور پر ہاتھ لگ جانے والے اس صحیح تصورِ حقیقت کے ساتھ ان حقائق کی مناسبت یا مطابقت بآسانی دیکھ سکے ورنہ اس تصورِ حقیقت کے ساتھ ان کو علمی اور عقلی طور وابستہ کرنے کا امکان نہ پائے گا اور کسی اور تصورِ حقیقت کی تلاش میں بدستور سرگرداں رہے گا۔ وہ یہ سمجھتا رہے گا کہ علمی حقائق اس تصورِ حقیقت کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتے اور لہٰذا یہ تصوّرِ حقیقت شاید درست نہیں یا شاید اس کی بنا پر کوئی فلسفہ تعمیر نہیں کیا جا سکتا۔ حالانکہ اس صورت میں کمی اس کے تصوّرِ حقیقت میں نہ ہوگی بلکہ ان حقائق علمی کی تعداد اور نوعیّت میں ہوگی جو اس کے پیشِ نظر ہوں گے تاکہ فلسفی کا تصوّرِ حقیقت کائنات کے علمی حقائق سے بغلگیر ہو جائے ضروری ہوگا کہ کچھ تو اس کا تصورِ حقیقت زیادہ سے زیادہ صحیح اور کامل ہو کر ان حقائق کی طرف آگے بڑھے اور کچھ یہ حقائق ترقی کر کے اس کی طرف پیش قدمی کریں یہاں تک کہ اس کے ساتھ ان کے مجموعہ کی مناسبت آشکار ہو جائے۔

تصوّرِ حقیقت کے عشق کی ضرورت

یہاں شاید یہ سوال کیا جائے گا کہ یہ بات تو سمجھ میں آسکتی ہے کہ اپنے مقصد کو پانے کے لیے ایک فلسفی کو حقیقتِ وجود کے صحیح تصوّر سے واقف ہونا چاہیے لیکن ایسا کیوں ہے کہ اسے اس تصوّرِ حقیقت کے ساتھ عشق بھی ہونا چاہیے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اقبال کا یہ خیال قطعی طور پر درست ہے کہ علم کا سرچشمہ انسان کا وجدان ہے اور وجدان کا باعث ہماری آرزوئے حسن یا عشق ہے۔ صحیح تصورِ حقیقت کا کامل عشق ہی اس کا کامل وجدان یا کامل

علم ہے۔ اتنا کامل علم جتنا کہ کسی شخص کی فطری استعداد علم اس کو کامل ہونے کی اجازت دے سکتی ہے

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

سپاہ تازہ برانگیزم از ولایتِ عشق — کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است
زمانہ ہیچ نداند حقیقتِ اورا — جنوں قباست کہ موزوں بقامتِ خرد است
بآں مقام رسیدم چو در برش کردم — کہ طوفِ بام و درِ من سعادتِ خرد است

قدرت نے ہر انسان کو عشق کی ایک خاص استعداد بخشی ہے۔ یہ استعداد بالعموم افراد کی ذہانت کی نسبت سے کم و بیش ہوتی ہے کوئی چاہے تو اسے غلط تصورِ حقیقت یا غلط محبوب کے لیے کام میں لائے اور کوئی چاہے تو اسے صحیح تصورِ حقیقت یا صحیح محبوب کے لیے استعمال کرے لیکن چونکہ استعداد ایک ہی ہے یہ بات ہر حالت میں درست رہے گی کہ جس حد تک کہ وہ اسے غلط تصورِ حقیقت کے لیے کام میں لائے گا اس حد تک وہ صحیح تصورِ حقیقت کے لیے میسر نہ آسکے گی انگریزی زبان میں ایک مثل ہے کہ ہو نہیں سکتا کہ آپ کیک کھا بھی لیں اور کیک آپ کے پاس جُوں کا توں موجود بھی رہے۔ اسی طرح سے ہو نہیں سکتا کہ آپ اپنی محبت کی استعداد کو کسی غلط تصوّر کے لیے استعمال بھی کرلیں اور پھر وہ صحیح تصوّر کے لیے بھی بچ رہے۔ جس نسبت سے ایک انسان کی محبّت خدا کے لیے بڑھتی جاتی ہے اسی نسبت سے باطل تصورات کی محبّت کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ بالکل مٹ جاتی ہے اس مقام پر صحیح تصوّرِ حقیقت کی محبّت اتنی کامل ہوجاتی ہے جتنی کہ انسان کی فطری استعداد اجازت دیتی ہو لیکن یہ مقام ابراہیم خلیل اللہ کا ہے جن کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے کہ وہ حنیف یعنی یک بین و یک اندیش تھے اور ان کا ایمان شرک کے تمام شوائب سے پاک تھا۔ غیر اللہ کی محبّت کی تمام قسموں کو دل سے نکال کر اس مقام کو پالینا بڑے جاہدہ کے بعد ہی ممکن ہوتا ہے

برا ہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

اگر فلسفی کی ساری استعدادِ محبت جو اسے فطرت کی طرف سے ارزانی ہوئی ہے ابھی حقیقت

وجود کے صحیح تصور کیلئے وقف نہ ہوئی ہو اور اس استعداد کا کچھ حصّہ کسی غلط تصوّرِ حقیقت کے لیے بھی کام آرہا ہو تو وہ لازماً حقائق عالم کو کسی قدر اس غلط محبّت کی عینک سے دیکھے گا اور ان کی جو توجیہہ کرے گا وہ کامل طور پر درست نہ ہو سکے گی یعنی وہ ان حقائق کو صحیح تصورِ حقیقت کے ساتھ ٹھیک طرح سے متعلق نہ کر سکے گا اور لہٰذا وہ ایسا فلسفہ پیدا کرے گا جو اسی نسبت سے غلط اور ناقص ہو گا جس نسبت سے اس کی محبّت غلط اور ناقص ہو گی۔ صحیح تصورِ حقیقت کے کامل طور پر تربیت یافتہ روشن اور طاقتور وجدان سے مراد اس تصور کی ایک ایسی محبّت ہے جو مجاہدہ اور ریاضت سے ترقی کر کے درجۂ کمال پر پہنچائی گئی ہو۔ یہ محبّت ایک روشنی ہے کیونکہ یہ غلط تصوّرات کی جہالتوں اور تاریکیوں سے پاک ہوتی ہے اور صحیح اور غلط اور نیک و بد اور زشت و زیبا میں ٹھیک ٹھیک امتیاز کر سکتی ہے۔ پھر یہ محبّت ایک طاقت ہے کیونکہ یہ غلط تصورات پر ان کی غیر معمولی قوت کے باوجود فتح پاتی ہے۔ صحیح تصور کے کامل عشق کے بغیر فلسفی کا علم ناقص رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے نزدیک صحیح تصورِ حقیقت کا کامل عشق صحیح فلسفہ کی تعمیر کے لیے ضروری ہے اس کے بغیر عطار یا رومی یا رازی یا غزالی ایسا ایک شخص بھی علم سے محروم رہتا ہے۔

عطار ہو رومی ہو رازی ہو غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

(جاری ہے)

بقیہ منشورِ اسلام

اس قوم کے نصب العین پر آکر رُک جاتا ہے جس کا وہ ایک رکن ہوتا ہے۔ شاذ ہی ایسا ہوتا ہے کہ کسی شخص کا نصب العین اُس قوم کے نصب العین سے اُونچا ہو جائے جس میں وہ جنم لیتا ہے۔ ایسا شخص اگر دوسروں کو اپنے نصب العین کے حُسن و کمال کا معترف نہ بنا سکے تو اس کی قوم کے لوگ اسے ایک دیوانہ یا باغی یا انقلابی سمجھتے ہیں اور اُسے دبانے اور مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔

عبدالکریم عابد

پرویز صاحب کے افکار کا شجرۂ نسب

یہ مضمون مارچ ۵۶ ۱۹ء میں جناب ماہر القادری مرحوم کے ماہنامہ "فاران" میں شائع ہوا تھا اس کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر اسے حکمت قرآن میں شائع کیا جا رہا ہے - (ادارہ)

(قسط دوم)

اور ایک معجزات ہی پر کیا موقوف ہے۔ ملائکہ اور وحی کی حقیقت کو بھی ان معتزلیوں نے مسخ کر کے رکھ دیا۔ ان کے نزدیک ملائکہ اصل میں اس جسم کے مختلف حواس ہیں اور انسان میں ایک خاص حس جبریلی بھی ہوتی ہے جو وجدان "الہام" اور وحی کی صورت میں درجہ بدرجہ ترقی پاکر نمایاں و ظاہر ہوتی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے مولانا روم کی سوانحعمری میں وحی و ملائکہ کے بارے میں معتزلیوں کا نقطۂ نظر بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے۔ اس نقطۂ نظر کا خلاصہ یہ ہے کہ حواس انسانی میں وجدانیات کا ملکہ جو مذہبی زبان میں جبریل کہلاتا ہے ارتقاء پاکر الہام اور پھر وحی کے پیام سنانے لگتا ہے اور جس زبان سے یہ پیامات جاری ہوں وہ شخصیت پیغمبر یا رسول کہلاتی ہے، گویا وحی انسان کی اپنی داخلیت کی انتہائی مکمل شکل ہے اور جس طرح ذہانت عام ہونے کے باوجود جینیس (Genious) کا مرتبہ کم ہی افراد کو ملتا ہے، اسی طرح وجدان گو ہر شخص کے ساتھ ہے لیکن وحی کے ...ل کوئی کوئی اور کبھی کبھی ہی رہے ہیں۔ اکثر معتزلہ نے یہ بھی کہا ہے کہ باطنی استغراق اور داخلی توجہ کی اعلیٰ ترین کیفیت میں سوچ بچار کی ایک خاص منزل پر الفاظ متشکل ہو کر ایک عجیب الخلقت وجود کی صورت میں باتیں کرتے ہیں اور گو کہ یہ وجود خارج میں موجود نہیں رہتا ہے۔ مگر اپنی داخلیت میں ہمہ تن متوجہ شخص کو محسوس ہوتا ہے اور اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔ پیغمبروں کا جبرئیل یہی عجیب الخلقت وجود ہے اور وحی اسی باطنی استغراق اور داخلی توجہ کی اعلیٰ ترین کیفیت کا نام ہے، چند معتزلہ نے حقیقتِ وحی کی سائنٹفک تعبیر کے سلسلہ میں یہ بتایا کہ عقل تمام انسانی زندگی کے مسائل و معاملات کو حل کرنے کے لئے کافی ہے۔ مگر چونکہ عام انسانی عقل پر جذبات

وخواہشات کا غلبہ رہتا ہے اس لئے وہ راہ سے بھٹک جاتی ہے۔ اگر ہم کسی طرح عقل کو خواہشات وجذبات کے تسلط سے آزاد کرالیں تو عقل بالکل شدھ اور پاک ہو جائے گی۔ اس پاک حالت میں عقل جو کچھ سوچے گی یا سمجھے گی وہ صحیح ہوگا اور اصل میں وحی عقل کی اسی تزکیہ شدہ حالت کا نام ہے۔

وحی کو انسان کی داخلیت کا کارنامہ سمجھنے ہی کا نتیجہ ہے کہ شاعری کو بھی پیغمبری کا ایک جزو مان لیا گیا۔ کیونکہ اس کے مضامین اور خیالات کا تعلق بھی داخلیت کے اسی غیب سے ہے جو انسان میں پوشیدہ ہے۔

عقیدۂ آخرت، جنت، دوزخ، جو ہر مسلمان کا ایمان ہے، یہ کم بخت اس پر بھی ہاتھ صاف کر گئے۔ مسلک اعتزال کہتا ہے کہ جنت، دوزخ، دراصل ان دو کیفیات کا نام ہے جو اس مادی زندگی میں ہمارے اعمال کے نتیجہ میں راحت وتکلیف کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ نیز آخرت سے مقصد صرف خدا کا قانون عدل ہے۔

اور تو اور ان عقل پرستوں نے حد یہ کر دی کہ قرآنی آیات کو اپنی تاویلات کے رندے سے چھیل چھال کر خالص دہریت اور مادہ پرستی کے فلسفہ کو بھی قرآنی حکمت ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کون نہیں جانتا کہ الحاد اس کائنات سے باہر یا خارج میں خدا کے کسی وجود کا منکر ہے۔ ان معتزلیوں کا پیدا کردہ ایک اسکول جسے بالکل غلط طور پر حضرت محی الدین ابن عربیؒ سے متعلق کر دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ خدا خارج از کائنات کہیں موجود نہیں ہے اور صرف انسان ہی انا الحق کہہ کر ادعائے خداوندی اور منصب پروردگاری پر فائز ہے۔ قرآن میں جس ہستی کو خدا کہا گیا ہے وہ تمام موجودات میں پنہاں ایک طاقت ہے۔ یعنی رب العلمین کی اس انرجی کا نام ہے جو مادہ میں پائی جاتی ہے اور چونکہ مادہ کی اپنی اس انرجی سمیت سب سے زیادہ ارتقا یافتہ شکل انسان کی ہے، اس لئے خدا کا نشان اور سراغ نفس انسانی کی گہرائیوں میں ملے گا اور انسان مجاز ہے کہ وہ انا الحق کہہ اٹھے۔ ویسے انرجی یا خدا ہر شجر وحجر، چرند وپرند میں اپنا جلوہ دکھتی ہے۔ اس لئے تمام موجودات خدا ہیں۔

عقل پرستی اور ریشنلزم کے نتیجہ میں پیدا شدہ یہ غلط تصورات مسلم جماعت کے لئے بڑے تباہ کن ثابت ہوئے گو کہ ہمارے صوفیائے کرام نے ان رجحانات کا مقابلہ اسلامی تصوف سے

کرنا چاہا اور اس میں وہ خاصے کامیاب رہے۔ لیکن پھر بھی اس کی جڑیں ہمارے معاشرے میں بڑی دور تک سرایت کر گئی تھیں۔ اس کا ثبوت صرف اس واقعہ سے مل سکتا ہے کہ اس دور کے خواص ہی نہیں عوام بھی "جنات" کے وجود کو ماننے کے لئے آمادہ نہ تھے۔ کیونکہ "جن" مشاہدہ و عقل کی دسترس سے باہر اور غیر مرئی مخلوق ہیں۔ عقل پرستی کی یہ وبا کچھ ایسی عالم گیر شکل اختیار کر گئی تھی کہ اس نے ایمان کو دلوں سے کسی حد تک رخصت کر دیا تھا ۔ اور اب مسلمانوں کے لئے خدا کی رضا اور آخرت کے خیال میں کوئی کشش نہیں تھی بلکہ ان کی تمام تر صلاحیتیں علمی موشگافیوں کی خاطر ضائع ہو رہی تھیں ۔ اور مذہب کے سلسلہ میں اس عقلی تفکر کا اگر صلہ کچھ تھا تو وہ یہ کہ خود بعض لوگ مذہبی نراج اور انارکی کا شکار ہو گئے ۔

یقیناً مذہب کو سمجھنے، جاننے اور عمل کرنے کے لئے عقل کی ضرورت ہے ۔ مگر سوال یہ ہے کہ وہ مذہبی اعتقادات جن کا تعلق ایمان بالغیب سے ہے، آخر کس طرح عقلِ انسانی اور علم انسانی کے احاطے میں آ جائیں گے، ہماری عقل اور ہمارا علم بہرحال نامکمل اور ناقص ہے، اس محدود اور ناقص عقل و علم کی سمجھ میں اگر چند مذہبی حقائق نہیں آتے ہیں تو ہم آخر ان حقائق کو مسخ کرنے کی کیوں کوشش کریں؟ صاف بات یہ ہے کہ اگر آپ کو وحی کے علم پر اطمینان نہیں ہے تو اس کا انکار کر کے عقل کو اپنا معبود بنا لیجیے، مگر وحی کو ماننے کے بعد عقل کے آزادانہ استعمال کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن و حدیث کی کچھ باتیں اگر ہمارے علم یا عقل سے متصادم ہوں تو تحریف کے ذریعہ انہیں مٹانے کی بجائے ہمیں صبر کے ساتھ یہ انتظار کرنا ہوگا کہ عقل یا علم ارتقاء پا کر اور آگے بڑھ کر اس منزل تک آئیں جہاں سے مذہبی حقائق کی تصدیق ممکن و آسان ہو جاتی ہے ۔

اس حقیقت کو معتزلہ نے سمجھنے پر توجہ نہیں دی ۔ اسی لئے وہ مذہب میں چند اصلاحات کر کے اسے عقل کے مطابق بنانا چاہ رہے تھے اور اب پرویز صاحب انہی کے نقش قدم پر رواں دواں ہیں۔ مگر خدارا سوچئے کہ بچپن، جوانی اور بڑھاپے کی ہر نئی منزل پر بدل جانے والی عقل کا یہ عالم آرا، انتشار اور مشرق و مغرب، شمال و جنوب کے ہر گوشے میں نئے نئے سبق سکھانے والی یہ تفرقہ انگیز عقل جو ہر ہر قدم پر مختلف صورتوں کے ساتھ نظر آ رہی ہے۔ اس کے ہجوم میں

قرآن بیچارہ کیا کرے گا ؟ اگر وحی الٰہی کسی عقل کے خلاف پڑے تو قرآن پر کیا ذمہ داری ہے اور اگر کسی کی عقل میں آجائے تو اس کی خوبی میں کونسا اضافہ ہوتا ہے ۔ خوب یاد رکھئے کہ عقل و سائنس کے خود ساختہ اصولوں کی خاطر حقائق وحی میں بگاڑ پیدا کرنا مذہب کے ساتھ سب سے بڑی غداری ہے ۔ قرآنی الفاظ کو جدید معانی سے آراستہ کرنے کا وہ کام جو پرویز صاحب انجام دینا چاہتے ہیں اس کی راہ میں سب سے بڑی زبردست رکاوٹ سنّتِ رسول اور طریق صحابہؓ ہے ۔ یہ رکاوٹ آج کی طرح زمانہ گزشتہ میں بھی معتزلیوں کے راستہ میں حائل ہوئی تھی ۔ اس لئے انہوں نے محدثین کرام کو بُرا بھلا کہنا اور حدیث کی اہمیت کے خلاف طرح طرح کی باتیں کرنا اپنا شعار بنا لیا تھا ۔ اور اس وقت سے لے کر اب تک فتنۂ انکار حدیث مسلسل کسی نہ کسی صورت میں چلا آرہا ہے ۔

حضرت امام شافعیؒ نے اپنے رسالہ میں انکارِ حدیث کے اس مسلک کا بڑا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور اس لغو و غلط نظریہ کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں ۔ امام شافعیؒ کے علاوہ اور دوسرے ائمۂ دین و بزرگان دین بھی اس گمراہ کن عقیدے کے خلاف ہمیشہ مصروف جہاد رہے اور آج بھی علمائے حق اس فتنہ کا مقابلہ کر رہے ہیں ۔

ان علماء کا کہنا ہے کہ اگر آپ حدیث کو دین میں اتھارٹی یا سند تسلیم نہ کریں تو پھر آپ کے مذہب کی بنیاد کیا رہ جاتی ہے ۔ کیونکہ جن ہاتھوں اور جن ذرائع سے ہم تک حدیث پہنچی ہے انہی ذرائع اور انہی ہاتھوں نے ہم کو قرآن بھی پہنچایا ہے ۔ اگر یہ واسطہ غیر معتبر ہے تو پھر صرف حدیث ہی نہیں قرآن کا بھی انکار کرنا ہوگا ۔ علاوہ ازیں سنّتِ رسول اللہ اور سنّتِ صحابہؓ کو حذف کر دینے کے بعد قرآن کے معانی کس طرح متعین ہوں گے ۔ کیونکہ جہاں تک قرآن مجید کی آیتوں کا تعلق ہے اس کی تفسیریں بہت سی کیجاسکتی ہیں ۔ اور بہت سی ہوئی ہیں ۔ اب ان میں صحیح کونسی ہے اور غلط کیا ہے ۔ اس کا فیصلہ تو صرف سنّتِ رسولؐ اور اسوۂ صحابہؓ ہی کو دیکھ کر کیا جاسکتا ہے اور فیصلہ کی اس کسوٹی کو اُٹھا کر پھینک دینے کے بعد ملّتِ مسلمہ ایک عظیم افتراق اور انتشار کا شکار ہو کر رہ جائے گی ۔ بلاشبہ آج ہم میں عملی انتشار بپا ہے اور جزئی مسائل پر ہزارہا اختلاف ہیں جو کبھی کبھی ناگوار صورت بھی اختیار کر جاتے ہیں ۔ لیکن اللہ کا شکر ہے